پروفیسر خواجہ غلام صادق

پروفیسر حمید احمد خاں

مجھے پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے ساتھ تین حیثیتوں سے ملنے اور کام کرنے کا موقعہ ملا۔ ایک بحیثیت شاگرد کے، دوسرے اسلامیہ کالج اور یونیورسٹی میں بطور رفیقِ کار کے اور تیسرے بطور معاونِ انتظامی امور۔ ان تینوں صورتوں میں انھیں میں نے وجودی طور پر مذہبی پایا۔ وجودی طور پر مذہبی یا اخلاقی ہونے سے میری مراد ایسی شخصیت ہے جس کے عقائد، اصول یا اقدار، اعمال سے ظاہر ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ برطانوی فلسفی پیٹر کا قول درست ہے کہ کسی شخص کے اعمال اس شخص کے اخلاقی اصولوں کو الفاظ سے زیادہ بلند آواز میں ادا کرتے ہیں۔ زبان سے اصولوں کا دعویٰ کرنا اور عملی زندگی کا اصولوں کی تصویر و تفسیر ہونا ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاں صاحب مرحوم کے شاگرد، دوست اور رفقائے کار ان کا دلی احترام کرتے تھے اور ان کی مضبوط شخصیت کی بنا پر ان سے بات کرتے ہوئے ہچکچاہٹ بھی محسوس کرتے تھے۔

پروفیسر حمید احمد خاں میرے نزدیک تکمیل پسند (Perfectionist) تھے اس لیے اصلاحِ احوال کا عمل انھوں نے زندگی بھر جاری رکھا۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو ہر کام میں نمایاں تھا۔ کالج کی معمولی سے معمولی تقریب ہو یا کلاس لیکچر ہو یا دفتر کا کوئی سرکلر جاری کرنا ہو، پروفیسر حمید احمد خاں کی تکمیل پسندی کی جھلک ہر بات سے ٹپکتی تھی۔ یہاں تک کہ لفافے میں مراسلہ بند کرنا، کاغذوں کو پن لگانا یا مہمانوں کو چائے پیش کرنا ان تمام امور میں بھی متعلقہ افراد کو مناسب ہدایات دیتے تھے۔ کاغذوں کو پن لگانے کے بارے میں ایک دن مجھے کہنے لگے کہ پن کو کاغذوں میں دو مرتبہ کے بجائے اگر تین مرتبہ گزارا جائے تو کبھی بے احتیاطی میں پن شدہ کاغذوں کو اٹھانے میں پن چبھنے کا خطرہ نہیں رہتا اور پن کی کاغذوں پر گرفت بھی مضبوط رہتی ہے۔ اس کے بعد پن کو کاغذوں میں سے گزار کر دکھایا

اور کہا کہ میں نے یہ بات میاں بشیر احمد سے سیکھی ہے۔

اگر کالج لان میں کوئی ایسی تقریب منعقد کرنی ہوتی جس میں قناتیں اور شامیانے لگانے ہوتے تو خاں صاحب تقریب سے ایک روز قبل اس بات کا خود جائزہ لیتے کہ دھوپ اور سایہ کی تقریب کے وقت کیا صورت ہوگی، تاکہ قناتیں ایسے رُخ پر لگائی جائیں کہ سورج کی کرنیں مہمانوں کے چہروں پر نہ پڑیں۔ الغرض خاں صاحب مرحوم کی تکمیل پسندی کا یہ عالم تھا کہ معمولی تفصیلات پر بھی دھیان دیتے تھے۔ چنانچہ جب نیو کیمپس ہوسٹل تعمیر ہوئے تو آپ نے ہوسٹل کی عمارات کا معائنہ کرنے کے بعد پراجکٹ ڈائرکٹر کرنل شہباز خاں سے کہا کہ ہوسٹل کے کمروں میں جالی دار دروازے بھی لگائے جاتے تو طلبہ اور طالبات کو مچھروں سے نجات ملتی۔ یہ سن کر کرنل شہباز خان نے انگریزی میں کہا:

But don't you know, sir, there will be no Mosquitoes in the Campus.

اس پر خاں صاحب نے برجستہ جواب دیا:

Why! do they need visa from Wahdat colony?

جس طرح نیو کیمپس کی عمارات تعمیر کرتے وقت موسم کا خیال نہیں رکھا گیا، اسی طرح طلبا اور طالبات کے رہائشی کمروں میں بھی جالی دار دروازے نہیں لگائے گئے۔ اگر پروفیسر حمید احمد خاں کے زمانۂ وائس چانسلری میں کیمپس کا ڈیزائن اور نقشے تیار ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان خامیوں کو ضرور دور کرتے۔

خاں صاحب مرحوم کی تکمیل پسندی کا ذکر میں نے ان کی زندگی کے ان واقعات کے حوالوں سے کیا ہے جنھیں عام طور پر غیر ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ اگر زندگی کے ہر کام میں یکسانیت کی جھلک ہو تو یہ بات شخصیت کی پختگی پر دلالت کرتی ہے۔ تحریر و تقریر میں خاں صاحب جو احتیاط برتتے تھے وہ ان کے ملنے والوں یا ان کے ساتھ کام کرنے والوں سب پر عیاں ہے۔ کسی جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبہ کے مسودہ میں ترمیم پریس بھیجے جانے کے بعد بھی کرتے اور جب تک پروف ریڈنگ خود نہ کرتے، ان کی کسی تحریر کا پرنٹ آرڈر نہیں

دیا جاتا تھا۔ تحریر میں احتیاط برتنے کا یہ عالم تھا کہ کسی ایسی کتاب کا مقدمہ لکھنے سے معذرت کرتے جس کے مصنف کی تحریر ان کے اپنے معیار پر پوری نہ اُترتی بلا امتیاز اس کے کہ مصنف کا ان سے کتنا گہرا اور دوستانہ تعلق کیوں نہ ہوتا۔ اور کسی تحریر کے بارے میں ایسی رائے وہ بڑی دیانت داری سے قائم کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے کہنے لگے میرے فلاں دوست نے فلاں شاعر کی کتاب کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور مجھے اس کا مقدمہ لکھنے کو کہا ہے مگر میں مجبور ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ مجھے اس کتاب کا مقدمہ لکھنا چاہیے۔ اگرچہ میرے اس دوست کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ جب میں کیمبرج گیا تھا تو میری مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی اور میرے اس دوست نے جو پیشہ کے لحاظ سے معلم تھے، یہ پیش کش کی تھی کہ وہ اس قابل ہیں کہ اپنی تنخواہ سے ایک صد روپیہ ماہوار آسانی سے میرے بچوں کو بھیج سکتے ہیں۔ میں ان کے اس جذبے کی بے حد قدر کرتا ہوں۔ مگر مجبور ہوں کہ میں نے مقدمہ تحریر کرنے سے معذرت کر دی ہے۔

اگر کسی رفیق کار یا دوست کی تحریر کی تعریف کرتے تو وہ اُسے ایک بہت بڑا اعزاز سمجھتا اور فی الواقع یہ تھا بھی ایک اعزاز۔ ایک دفعہ کالج میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کو مدعو کیا گیا اور ان کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا اس کا ڈرافٹ پروفیسر اختر اقبال کمالی نے تیار کیا تھا۔ خاں صاحب نے پروفیسر کمالی کا ڈرافٹ معمولی رد و بدل کے بعد قبول کر لیا۔ اپنی تحریر کی اس پذیرائی پر کمالی صاحب بے حد مسرور ہوئے اور مجھے انھوں نے خود کہا کہ اس سے بڑھ کر انھیں سند کہیں دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی تھی۔

خاں صاحب مرحوم کو میں نے اکثر و بیشتر اوقات مصروف پایا۔ پرنسپل بننے سے پہلے بھی ان کے پاس فرصت کے اوقات کم تھے۔ لیکچر شروع ہونے سے کچھ عرصہ پہلے کالج تشریف لاتے اور آتے ہی اپنی ڈائری دیکھتے اور کالج میں کرنے والے کاموں کی ایک لمبی فہرست ہوتی۔ فلاں صاحب کو خط لکھنا ہے۔ فلاں طالب علم کے لیے سرٹیفکیٹ تحریر کرنا ہے۔ فلاں سے ملاقات کا وقت طے ہے۔ بزمِ فروغِ اُردو کے اجلاس کے لیے انتظام کرنا ہے۔ لکھتے وقت کبھی لغت کا بکثرت استعمال کرتے اور شاگردوں کو بھی یہ تلقین کرتے کہ الفاظ کے درست

استعمال کے لیے لغت، ذوق [illegible] ہو۔

ہر استاد کا اپنے شاگردوں پر ایک رنگ [illegible] ہے اور اس اثر میں بہت سے عوامل شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً استاد کی [illegible] لیکچر کے لیے تیاری، ذہنی پختگی، کام سے لگن، اخلاقی اقدار، استاد کا لباس [illegible] قول و فعل میں مطابقت، طلبا کے لیے محبت اور شفقت [illegible] وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سارے عوامل لاشعوری طور پر طلبا پر [illegible] استاد اپنی عزت و تکریم اپنے عمل سے پیدا/حاصل کرتا ہے۔ [illegible] اس کے لیے صرف اہلیت ہی شرط ہے [illegible] پیشہ کو اختیار کرنے سے قبل یہ طے کر لینا چاہیے کہ [illegible] کے لیے تیار ہیں۔ اگر طلبا اور اساتذہ کے درمیان کشیدگی ہو تو [illegible] اپنے مقصد میں ناکام ہوتے ہیں اور ان [illegible] منتج ہوتی ہے۔ اس دور کا علم صرف [illegible] عمل میں کالج اور یونیورسٹی [illegible] لیکچر یا تقریر کام کرتی ہے۔ مگر [illegible] تحریر لازمی ہے۔ تحریر ہی سے آپ اپنے دل کا [illegible] پیدا ہوتے ہیں اور تحریر ہی سے آپ [illegible] آپ کے علم کی تصدیق [illegible] احباب کر سکتے ہیں [illegible] اندرون اور بیرون ملک موجود ہوتے ہیں۔ [illegible] ضروری ہے کہ آپ خویش را دیدن بنور خود [illegible] مراحل سے گزریں، جن کا اوپر ذکر کیا [illegible] آپ کو اپنے نور سے دیکھنے کے مترادف ہے اور اہل علم سے [illegible] اپنے آپ کو دوسروں کے نور سے دیکھنا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان کی زندگی [illegible] اور "خویش را دیدن بنور دیگراں" کی ایک روشن مثال ہے۔

طلبا کے جھگڑے انتظامیہ سے ہوتے ہیں۔ اساتذہ کے لیے اب بھی وہ رواداری اور محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ ان میں "جوہرِ قابل" موجود ہو اور دوسرے بیرونی عناصر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فضا خراب نہ کریں۔ انسانی رشتے میل جول سے پروان چڑھتے ہیں اور جب تک استاد اور شاگرد کے درمیان بقول خاں صاحب عقلی اور جذباتی تعاون نہ ہو، دوستی اور یگانگت کی وہ فضا پیدا نہیں ہو سکتی، جو طلبا کی صحت مند ذہنی نشوونما کے لیے ازبس ضروری ہے۔ خاں صاحب مرحوم اس بات کے شدت سے قائل تھے کہ اساتذہ اور طلبا کے درمیان قریبی اور دلی تعلقات قائم ہونے چاہییں۔ ۱۹۴۰ میں جب مجھے خاں صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تو وہ بات جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خاں صاحب کی طلبا یعنی اپنے شاگردوں سے قریبی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ کالج میں آپ واحد استاد تھے جو حاضری لیتے وقت طلبا کے نام پکارتے تھے، اگرچہ کلاس میں طلبا کی تعداد ۲۰۰ کے قریب تھی۔ باقی تمام اساتذہ رول نمبر پکار کر حاضری لیتے تھے۔ نام پکارنے سے استاد اور شاگرد میں I and Thou من و تو کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ رول نمبر پکارنے سے I and It من و شے کا تعلق جنم لیتا ہے۔

تعلیمی اداروں کا امن قائم رکھنے کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بیرونی عناصر کا عمل دخل سختی سے بند کرنا چاہیے۔ کیمپوں پر بعض نام نہاد طلبا، پستول، ریوالور اور سٹین گن لیے پھرتے ہیں گویا تعلیم حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ دشمن پر حملہ کرنے کی غرض سے درس گاہوں میں آ نکلے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہم بعض ایسے لوگوں کو داخلہ دیتے ہیں جو طالب علم نہیں ہوتے جن میں علم کی طلب نہیں ہوتی۔ وہ تو "سیرِ گل" کے لیے آتے ہیں یا پھر غنڈہ گردی کے لیے آ دھمکتے ہیں۔ موخر الذکر کا وجود درس گاہوں کا امن پارہ پارہ کرتا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے ۱۱ر مارچ ۱۹۶۶ کے ایک خطبۂ صدارت میں پاکستانی قوم کو انتباہ کیا تھا کہ ایشیا کی قسمت کا فیصلہ ایشیا کی یونیورسٹیوں میں ہو گا۔ ہمارے ممالک ہمارے طلبا کی روشن ضمیری اور قوتِ عمل سے زندہ رہیں گے یا پھر انہی طلبا کے ہنگامۂ تخریب و انتشار سے پارہ پارہ ہو کر فنا ہو جائیں گے۔" ہماری درس گاہوں میں امن کا یہ عالم ہے کہ

امسال یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات کے دوران کسی ناخوش گوار واقعہ کے پیش نہ آنے پر یونیورسٹی انتظامیہ کو مبارک باد کے پیغامات وصول ہوئے ہیں۔ گویا پرامن ماحول میں یونین کے انتخابات کا ہونا ایک غیر متوقع بات تھی۔

نظم و ضبط میں خلل، تعلیمی عمل میں سرگرمی کا فقدان، تعلیمی معاملات کا بذریعہ دباؤ حل یہ باتیں اس امر کی غمازی کر رہی ہیں کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں ایک ایسا خلا پیدا ہو رہا ہے جسے پُر کیے بغیر ہم اپنا قومی تشخص قائم نہیں رکھ سکتے۔ اساتذہ سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنے اسی خطبہ میں پروفیسر حمید احمد خان نے فرمایا تھا۔

"خدا کے لیے قوم کی تعلیم میں اس بڑھتی ہوئی خلیج کو استاد و شاگرد کے درمیان حائل نہ رہنے دیجیے، ورنہ یاد رکھیے کہ ہماری سرحدوں کے باہر سے غنیم کا حملہ ہماری زندگی کو خطرے میں ڈالے یا نہ ڈالے ہمارا تعلیمی خلفشار ہمیں صفحۂ سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گا۔"

تعلیمی عمل ایک دوطرفہ عمل ہے جس میں استاد اور شاگرد دونوں برابر کے شریک ہیں اور یہ عمل اسی صورت میں ممکن ہے، جب استاد اور شاگرد کے درمیان مکمل تعاون ہو۔ اگر ہمارا تعلیمی عمل ہمارے قومی تشخص کی بنیاد کو ہی زیر و زبر کرے تو یقین جانیے کہ ہم اجتماعی خودکشی میں مبتلا ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں اور کمپلکسوں میں خام مال سے ایسی اشیا تیار کی جاتی ہیں جو ہماری ضروریاتِ زندگی پوری کرتی ہیں اور ملکی معیشت کو بھی کسی حد تک استحکام بخشتی ہیں مگر ہماری درس گاہوں میں جو خام مال بھیجا جاتا ہے وہ ہمارے نوجوان ہیں جو ہمارا عزیز ترین سرمایہ ہیں اور جن کا ذہن لوحِ بے نقش کی طرح ہوتا ہے، جس پر تعلیمی عمل سے مختلف اقسام کے نقش و نگار پیدا کیے جاتے ہیں۔ اور اگر یہ اذہان قومی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے تیار کیے جائیں تو ایک ایسی متاع تیار ہوتی ہے، جس سے خزانہ عامرہ میں کوئی نوری اضافہ تو ممکن نہیں، مگر جس سے ہمارے قومی تشخص کی بنیادیں نوجوان ذہنوں میں مضبوط جڑیں پکڑتی ہیں اور اس سے ملکی سالمیت کو استحکام ملتا ہے۔

نظریۂ پاکستان کا مسکن نوجوانوں کے دل ہیں۔ ہماری درس گاہوں میں خلفشار اور

ہنگامے نظریاتی بنیادوں پر ہی برپا کیے جا رہے ہیں۔ ہمارا قومی تشخص ہی مسخ کیا جا رہا ہے اور اس تخریبی عمل پر قوم کی بے حسی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہم:

Low gradd chronic schizophrania.

میں مبتلا ہیں۔ اس اجتماعی بیماری کی نشانی کسی بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے بے توجہی ہوتی ہے۔ نظریاتی سرحدوں پر حملہ جغرافیاتی سرحدوں پر حملہ سے کہیں زیادہ خطرناک اور ضرر رساں ہوتا ہے اور اس حملے کا میدانِ جنگ، سرزمینِ وطن نہیں ہوتی۔ بلکہ تعلیمی ادارے، کتب خانے اور بک سٹال ہوتے ہیں۔"

اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں کے انتباہ کے بارے میں قومی سطح پر غور و فکر کیا جائے۔

ارمغانِ حالی

از پروفیسر حمید احمد خاں

شمس العلما الطاف حسین حالی اپنے دور کی عظیم شخصیت تھے۔ ان کی شہرت کا اصل باعث اگرچہ ان کی نظم کو قرار دیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو نظم و نثر دونوں اصنافِ سخن پر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ نظم کی طرح ان کا حصۂ نثر بھی بڑا جاندار اور متعدد موضوعات کو محیط ہے۔ وہ سوانح نگار بھی تھے اور ناقد بھی۔ مفکر بھی تھے اور مصلح بھی۔ انھوں نے اصلاحی، تعمیری، اخلاقی، تعلیمی اور معاشرتی وغیرہ مسائل سے متعلق عمدہ مضامین لکھے۔

یہ کتاب جو "ارمغانِ حالی" کے نام سے موسوم ہے۔ ان کی نظم و نثر کا قابلِ مطالعہ انتخاب ہے۔ کتاب میں حالی کے حالات و سوانح بھی مناسب تفصیل سے تحریر کیے گئے ہیں۔

صفحات: ۲۶۱ قیمت ۱۴/۰۰ روپے، سستا ایڈیشن ۹/۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور